Fikr-o-Nasar (Islamabad) 20:9-10 (1983)

موجودہ عدالتی نظام کی اسلامی عدالتی نظام میں تبدیلی

جسٹس آفتاب حسین

مندرجہ بالا عنوان میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ موجودہ عدالتی نظام جو انگریزی عدالتی نظام کے نمونے پر قائم کیا گیا ہے اسلامی عدالتی نظام سے متعارض ہے۔ اگر موجودہ عدالتی ڈھانچہ کی خصوصیات اور اسلامی عدالتی نظام پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔ تو اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ یہ مفروضہ کہاں تک صحیح ہے۔ اس مفروضے کی صداقت ثابت ہو جانے کے بعد ہی نظام کی تبدیلی کی بات ہو سکتی ہے اور اس سلسلے میں حائل مشکلات اور ان کے حل سے بحث کی جا سکتی ہے۔

عدالتی نظام کے متعلق یہ بات زیر غور رہنا ضروری ہے کہ اس میں عدالتی ڈھانچے کے علاوہ موجودہ قوانین کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا بھی جائزہ دیا جائے کیونکہ عدالتی نظام میں صرف عدالتی عمارت یا شخصیات یا اراکین کا ہی مفہوم داخل نہیں ہے، بلکہ جن قوانین کے تحت ان اراکین یا شخصیات کو عمل پیرا ہونا ہے اس کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے پر بھی اسلامی نظام کا بہت حد تک دارومدار ہے۔

جب شخصیات یا اراکین عدالت کا ذکر کیا جاتا ہے، تو اس کا مقصود وہ نام نہیں ہوتا ہے جس سے اس افسر کو جانا پہچانا جاتا ہے جو لوگوں کے جھگڑوں کو طے کرتا ہے یا ان کے دعووں کا فیصلہ کرتا ہے یا مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے کیونکہ خواہ اس کو سول جج، سیشن جج، ڈسٹرکٹ جج یا مجسٹریٹ کے کسی بھی انگریزی نام سے یاد کیا جائے یا اس کو قاضی، قاضی القضاۃ، صدر الصدور کے کسی بھی عربی نام سے پکارا جائے نام کا یہ فرق ان اشخاص کے یا عدالت کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کی کوئی دلیل ثابت نہیں ہوتا ہے۔ نام رکھنے کا تعلق حقیقتاً رواج اور زبان سے ہوتا ہے۔ ہم اگر چاہیں تو اپنے ججوں یا مجسٹریٹوں کو اردو یا عربی زبان کے ہم معنی ناموں سے پکار سکتے ہیں، یا اپنی سہولت کے لئے کوئی اور نام وضع کر سکتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ عدالتی ڈھانچہ محض منصب کے نام کی تبدیلی سے اسلامی یا غیر اسلامی نہیں ہو جاتا۔ اسلامی عدالتی نظام کے قیام کے لئے ان شخصیات کا مزاج اسلامی ہونا ضروری ہے جو لوگوں

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

کو انصاف فراہم کرتے ہیں۔ الحمدللہ پاکستان میں ماسوائے معدودے چند باقی سب اراکین عدلیہ اراکین انتظامیہ کی طرح مسلمان ہیں۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے قانون کا مطالعہ انگریزی زبان میں کیا ہے اور وہ فیصلے بھی اس زبان میں لکھتے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر کا مزاج محض اسلامی ہے جس کی ایک بڑی وجہ اسلامی ماحول میں ان کی پرورش ہے۔ میں نے اکثر صاحبان سے جو عدالتی نظام سے بحیثیت منصف منسلک ہیں اور جن میں سول جج، سیشن جج اور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان بھی ہیں یہ سنا ہے کہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر مقدمے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر کیا جائے۔ بحیثیت وکیل میں نے اکثر و بیشتر وکلاء کو اور بحیثیت جج میں نے تقریباً سب ججوں کو اکثر اللہ و رسول اور اسلام کی باتیں کرتے سنا ہے۔ ان حالات میں یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ ہمارا عدالتی ڈھانچہ جہاں تک افراد کا تعلق ہے کسی حیثیت سے بھی غیر اسلامی ہے۔ اس ملک کے نظام عدل میں شخصی قوانین کی کافی اہمیت ہے چنانچہ معاملات وراثت، شادی، طلاق تبنیت اور اس قسم کے دوسرے معاملات میں ہندوؤں کے مقدمات کا فیصلہ ان کے ذاتی قوانین کی رو سے کیا جاتا ہے جس کو ہم ہندو لا کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ وراثت، تبنیت، شادی بیاہ، طلاق، مہر، ہبہ، وصیت اور وقف وغیرہ سے متعلق مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ ان کے شخصی قوانین کے مطابق کیا جاتا ہے اور اس بارے میں اس حد تک احتیاط کی جاتی ہے کہ جو مسلمان حنفی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں ان کے معاملات حنفی فقہ کے مطابق اور جو دیگر کسی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں ان کے مقدمات کا فیصلہ ان کے اپنے مسلک کے مطابق کیا جائے اسی وجہ سے قانون کے طلباء کو اسلامی فقہ اور شخصی قوانین کی خاص طور پر تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے جج صاحبان خواہ وہ کسی بھی عدالت سے متعلق ہوں اور ہمارے وکلا صاحبان بھی اکثر و بیشتر اس علم پر کافی حد تک حاوی ہیں۔ چنانچہ اپنے کام کے دوران مقدمات کی تیاری اور تربیت اور فیصلہ کے سلسلہ میں ان کو ان قوانین کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس مسلمان نے فقہ اسلامی اور شخصی قوانین کا مطالعہ کیا ہو اس کا مزاج اگر اسلامی اصولِ عدل سے آشنا نہ ہو سکے تو یہ بڑے تعجب کی بات ہوگی۔

اسلامی نظامِ عدل اور دیگر نظام ہائے عدل کا موازنہ کرتے وقت یہ نکتہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اللہ کے متعدد ناموں میں سے ایک نام عدل ہے جس کے معنی ہیں عدل کرنے والا، اسی لئے عدل

اسلام کا ایک لازمی جزو ہے۔ بلکہ جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے ظاہر ہے، عدل ایک ایسا درمیانی راستہ ہے جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ عدل کو اسلام میں عدالت کے دائرہ کار تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ زندگی کے جملہ امور میں مثلاً خورد و نوش انفاقِ مال، باہمی تعلقات میں جابجا قیام عدل کی تاکید کی گئی ہے۔ حقوق العباد اور حق اللہ جن پر فقہ اسلامی کا دار و مدار ہے دونوں ہی عدل کی اہمیت کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقعہ پر اس کی تلقین فرمائی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عدل اور اس کی تبلیغ و تلقین کسی خاص زمانہ تک محدود ہو۔ ہبوطِ آدم سے آج تک مذہب اسلام کا یہ خاصہ رہا ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف اقوام پر مختلف انبیاء کی بعثت کا ایک مقصد تلقینِ عدل بھی رہا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ کفار اور مشرکین اس صفت سے بالکل ہی معری رہے ہیں۔ چنانچہ حمورابی کے قوانین سے لے کر آج تک ہر دور میں عدل کا تخیل کفار اور مشرکین میں بھی رہا اس وجہ سے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے ہزارہا سال سے مختلف ممالک میں عدالتیں قائم رہی ہیں اور قوانین کے نفاذ کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ خواہ وہ قوانین عرف یا رسم و رواج کی صورت میں ہوں یا کسی سربراہ مملکت یا سردار قبیلہ کے احکام کی شکل میں ہوں بلکہ حمورابی کے اور رامت موسیٰ کے قوانین میں بھی بعض مقام پر ایسی یکسانیت ہے کہ بعض مغربی مبصرین نے تو رائے ظاہر کی ہے کہ یہودیوں نے اپنے قوانین حمورابی کے قوانین سے ہی اخذ کئے ہیں۔ بہرحال یہ ضروری نہیں ہے کہ فروعاً ہر جگہ کے قوانین یکساں ہوں۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ فطری عدل کا اصول PRINCIPLE OF NATURAL JUSTICE موجود ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو مشرکین اور کفار معاشرے تو آپس کی کشمکش کا شکار ہو کر ہی ختم ہو جاتے۔

اگر اس نظریہ سے دیکھا جائے تو اسلامی نظام عدل اور دیگر نظام ہائے عدل کا فرق صرف ان قوانین سے متعلق رہ جاتا ہے۔ جن کا نفاذ مختلف عدالتیں کرتی ہیں۔ اس لئے اسلامی نظامِ عدل کے قیام میں شخصیتوں کے نام تبدیل کرنے کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے جتنی کہ قوانینِ حاضرہ کو مطابقِ اسلام کرنے کو حاصل ہونا چاہیئے۔ بالخصوص جبکہ ہمارے موجودہ عدلیہ کے اراکین اسلامی قوانین کے کافی حد تک ماہر بھی ہیں اور اسلامی مزاج بھی رکھتے ہیں۔

میرے کہنے کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ اس معاملہ میں کسی مزید پیش رفت کی ضرورت نہیں، بلکہ میرا تو

عقیدہ ہے کہ اسلامی نظامِ عدل کے قیام کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ ججوں کو بھی اسلامی قوانین بالخصوص قرآن اور حدیث کی تعلیم دی جائے اور اسلامی فقہ میں بھی ان کو ایسی تربیت دی جائے کہ اس معاملہ میں ان کو زیادہ سے زیادہ درک حاصل ہو۔ چنانچہ پاکستان میں اس سلسلہ کی پہلی کڑی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کا وہ کورس ہے جو سیشن ججوں اور پبلک پراسیکیوٹروں کی تربیت کے لیے جاری کیا گیا ہے اور جس میں انہیں کماحقہ کامیابی ہو رہی ہے۔ اس تربیتی پروگرام کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ کم سے کم مدت میں ہماری عدلیہ سے منسلک سب افسران اس تربیت سے مستفید اور فارغ التحصیل ہو جائیں۔

اسلامی نظامِ عدل کے قیام کے لئے بالآخر اس قسم کے قوانین کے اجراء اور عدم تنسیخ کا سوال رہ جاتا ہے جو شریعت مطہرہ یعنی قرآن اور سنت سے نہ صرف ہم آہنگ ہوں بلکہ کسی صورت میں بھی متعارض نہ ہوں۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بعض معاملات میں اس ملک میں شرعی قوانین نافذ ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ باقی قوانین کے متعلق بھی یہ جائزہ لیا جائے کہ وہ کس حد تک قرآن اور سنت رسول اللہ سے متعارض ہیں تاکہ اس حد تک حکومت کی طرف سے ان کی ترمیم و تنسیخ کا عمل مکمل کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ عدل کے قیام کی خاطر پاکستان کے ہر آئین میں کوئی نہ کوئی شق ایسی ضرور رکھی گئی جس کا مطلب ایک ایسے ادارے کا قیام ہے جو موجودہ قوانین کو قرآن و سنت سے ہم آہنگ کرنے کی سفارش کر سکے۔ چونکہ اس کام کے لئے ہر قانون کا بہت گہرا مطالعہ اور جائزہ ضروری ہے جو صرف ماہرین ہی انجام دے سکتے ہیں۔ اسی لئے ۱۹۷۳ء کے آئین میں اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام ضروری قرار دیا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں اسی ادارے کے ذریعے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے اسلامی حدود کے قیام کی راہ ہموار کرائی اور ان کے قوانین کو مدون کرایا۔ ویسے اس ادارے کا کام مختلف معاملات میں صرف مشورہ اور تجاویز پیش کرنا ہے کسی قانون کو نافذ کرنا اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ نیز کوئی شہری اس سے استفادہ کرنے سے قاصر ہے۔

صدرِ محترم نے پہلے ہائی کورٹوں میں شریعت بنچیں قائم کیں اور پھر اسی مقصد کے حصول کے لئے فیڈرل شریعت کورٹ قائم کیا تاکہ قوانین کو شریعت سے ہم آہنگ کرنے کے کام میں عوام کو بھی شریک کیا جا سکے اور اس ضمن میں حکومت بھی عدالت کے فیصلوں کی پابند ہو۔ آئین کی ان شقوں کا

جو اس عدالت کے قیام سے متعلق ہیں اولین منشاء یہی ہے کہ ملک کے قوانین کا قرآن و سنت سے تعارض دور کر کے ان کو اسلامی شریعت کے مطابق بنایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں شہریوں کی جانب سے بہت سی درخواستیں موصول ہوئیں اور مختلف قوانین کے متعلق عدالت سے ان قوانین میں ترمیم کرنے کا حکم صادر ہُوا۔

اسلامی نظریاتی کونسل تو صرف حکومت کے کہنے سے قوانین کا جائزہ لے سکتی ہے۔ لیکن عدالت قائم کر کے عوام کو بھی اختیار دیا گیا ہے کہ وہ عدالت کو درخواست دے کر مروجہ قانون کے تعارض کو جو قرآن و سنت سے ہے دور کرا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی مشکل محسوس ہوتی ہے تو وہ یہی ہے کہ عوام نے جن میں علماء اور ملک میں نفاذ شریعت کے بڑے داعیان بھی شامل ہیں اس کام میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لی۔ زیادہ تر درخواستیں جو عدالت کو موصول ہوئیں وہ یا تو ایسے صاحبان نے دیں جو اپنے کسی مقدمے کے سلسلہ میں شریعت کے ساتھ تعارض کو کسی قانون سے دور کرا کے اپنے نقطۂ نظر کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں وہ درخواستیں بھی شامل ہیں جو عدالت کے دائرۂ اختیار سے باہر ہونے کی بنا پر خارج ہوئیں۔ کچھ ایسے صاحبان نے بھی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جو واقعی غیر شرعی قوانین کی تنسیخ کے جذبے سے سرشار ہیں۔ لیکن وہ درخواستیں بالعموم ایسے معاملات سے متعلق تھیں جن کا اختیارِ سماعت اس عدالت کو آئین نے ابھی تفویض نہیں کیا۔ اسی طرح روزانہ عدالت میں ڈاک کے ذریعہ غیر متعلق درخواستیں موصول ہوتی رہتی ہیں، جو درخواست دہندہ کے ذاتی معاملات اور تنازعات کے متعلق ہوتی ہیں جن سے اس عدالت کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ درخواستیں اس غلط فہمی پر مبنی ہوتی ہیں کہ یہ عدالت ہر ذاتی تنازعہ کو نمٹانے کا حق یا اختیار رکھتی ہے۔ اس عدالت کے قیام کا مقصد جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہی تھا کہ پاکستان میں ہر شخص کو اجازت دی جائے کہ نافذ الحال قوانین میں سے جس کو وہ خلاف قرآن و سنت رسُول سمجھتا ہے ان کے متعلق عدالت سے استدعا کر سکے کہ تعارض دور کرنے کا فیصلہ کر کے مرکزی و صوبائی حکومتوں کو حکم صادر کرے کہ وہ قانون میں ضروری ترامیم کریں۔ شخصی تنازعات کا فیصلہ ابھی اس عدالت کے اختیار سے باہر ہے۔ اسی طرح آئینی اور مالی معاملات عدالتی ضابطہ کے متعلق قوانین اور مسلمانوں کے شخصی قوانین بھی فی الحال اس عدالت کے دائرۂ کار میں داخل نہیں ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ شریعت کے نفاذ کے لئے پاکستانی قوم کا جذبہ بہت عظیم ہے اور لوگ اپنی اپنی فکر کے مطابق اس سلسلہ میں اخبارات اشتہارات یا کتب کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن اس عدالت کے قیام کا فائدہ اٹھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر وہ ادارہ جو شریعت کے نام پر قائم کیا گیا ہے ان قوانین کے مطالعہ اور جائزے کا انتظام کرے جو عدالت کے اختیار سماعت کی حدود میں ہوں اور ساتھ ہی ان کے تعارض کو دور کرنے کے لئے باقاعدہ درخواستیں پیش کرانے کا انتظام کرے۔ اس سلسلہ میں لوگ شاید اخراجات سے خائف ہوں تو میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عدالت میں درخواست کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص وکلاء کی خدمات حاصل کرے جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قوانین میں حد شریعت سے تعارض کی نشاندہی اس طرح کرائی جائے کہ درخواست میں ان آیات قرآنی، احادیث نبوی اور فقہی آراء کا تذکرہ کیا جائے جو اس سلسلہ میں مفید اور معاون ہو سکتی ہوں۔ قواعد عدالت کے مطابق درخواست داخل ہونے کے بعد اس عدالت پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ معاملہ کی چھان بین کرکے اور قانون کے جواز اور عدم جواز کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ صادر کرے اور اپنی معاونت کے لئے علماء اور وکلاء کی خدمات حاصل کرے۔ درخواست دہندہ کی ذاتی حاضری بھی ضروری نہیں، کیونکہ اس کی درخواست کو اس کی غیر حاضری کی وجہ سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

میں سمجھتا ہوں، کہ اگر کوئی ادارہ اس سلسلے میں اتنی دلچسپی لے لے کہ وہ عدالت میں اپنی درخواست تحقیق و تفتیش کے بعد داخل کرے تو وہ اپنا فرض سمجھے گا کہ عدالت کی امداد کے لئے جہاں تک ہو سکے علماء اور وکلاء کی خدمات حاصل کرکے صحیح فیصلے پر پہنچنے میں عدالت کی مدد کرے۔ اس قسم کی امداد یقیناً قابل قدر ہوگی۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ اگر کسی قانون کے متعلق تعارض کی محض قرآن و سنّت اور فقہ کی روشنی میں نشاندہی بھی کر دی جائے تو عدالت کا فرض ہے کہ وہ اس پر قرآن و سنت کی روشنی میں قطعی فیصلہ صادر کرے۔ اب اس قانون سے فائدہ اٹھانا عوام کا اور ان اداروں کا کام ہے۔

بعض صاحبان کا خیال یہ ہے کہ موجودہ قوانین کو یک جنبش قلم ختم کرکے ایسے قوانین نافذ کئے جائیں کہ جو عربی فقہ کی ترکیبوں اور اصطلاحی الفاظ سے مزیّن ہوں۔ ان کو غالباً اس بات کا علم نہیں ہے کہ یورپ نے قانون سازی کے تمام اصول اور اسی طرح اصول عدل کے تمام کوائف مسلمانوں سے ہی حاصل

کئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اصول فقہ یا جورس پروڈنس مسلمانوں کی ہی ایجاد ہے جس کا سہرا امام شافعی کے سر رکھا جاتا ہے۔ اصول فقہ پر دنیا کے کسی قانون میں اس سے قبل کوئی کتاب نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانین قرآن اور سنت رسول اللہ سے بہت کم متعارض ہیں بلکہ اگر بغور تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اکثر قوانین کی زبان میں بھی شرعی قوانین اور فقہ کی زبان سے کافی مماثلت ملتی ہے۔ علاوہ ازیں قوانین عام طور سے عوام کے مفاد کو مد نظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں چنانچہ شرعی قوانین میں بھی یہی اصول کارفرما ہیں۔ جو قوانین بنی نوع آدم کی بہتری کیلئے بنائے جائیں ان میں یکسانیت کا ہونا قابل تعجب بات نہیں، اس لئے یہ تجویز کہ ان قوانین کو بیک جنبش قلم ختم کر دیا جائے، ایک تخریبی تجویز ہے۔ قانون کی تعمیر ایسا معمولی کام نہیں ہے جیسا کہ ناواقف سمجھتے ہیں قوانین کو عجلت میں مدون کرنے سے گوناگوں غلطیوں کا امکان ہوتا ہے۔ یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ ایک مضبوط عمارت کو جس کے نقائص معمولی ترمیم و مرمت سے دور ہو سکتے ہوں بالکل سطح زمین کے برابر کر دیا جائے تاکہ اسی جگہ بالکل نئی عمارت تعمیر کی جاسکے۔ قانون کی تدوین میں کافی وقت لگتا ہے اور اس کے اجراء سے قبل حالات حاضرہ اور مقصد تدوین کو مد نظر رکھ کر اس کے ایک ایک نقطہ کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔

اسلامی قوانین کی تدوین کا مقصد خواہ نئے قوانین بنا کر حاصل کیا جائے یا موجودہ قوانین میں ترمیم کر کے اس کے لئے ماہرین کو نہ صرف شریعت کی واقفیت ضروری ہے بلکہ حالات حاضرہ کے تقاضوں کا جاننا بھی از بس ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی علم ہونا چاہیئے کہ شریعت کا کونسا حکم تشریعی ہے جس میں بندے کو کوئی اختیار ماسوائے اس پر عمل کرنے کے نہیں ہے اور کونسے ایسے امور ہیں کہ جن میں معاملہ اس کے اختیار پر چھوڑا گیا ہے۔

موجودہ قوانین کو اسلامی بنانے کا کام فیڈرل شریعت کورٹ کے سپرد کر دیا گیا ہے جس پر عوام کو اعتماد کرنا چاہیئے، بلکہ ان کو اس ادارے سے قانونی طور پر رجوع کرنا چاہیئے۔ اس کورٹ میں یہ مسئلہ ان کی ذاتی کاوش سے درست ہو سکتا ہے۔ اگر ان کی کاوش سے قوانین حاضرہ بذریعہ ترمیم اسلامی رنگ اختیار کر سکتے ہیں تو تخریب کے عمل سے کیوں ابتدا کی جائے۔ اگر قوانین حاضرہ کو اس طرح ختم کیا گیا تو اس سے یکبارگی ابتری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مشکل یہ ہے کہ لوگ نفاذ شریعت کے سلسلہ میں بہ نسبت غور و فکر اور عمل کے جذبات

سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اس قسم کی تجویز لوگ محنت سے جان چھڑانے کے لئے کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اصحاب سمجھتے ہیں کہ کسی ایک فقہ کی روشنی میں قانون کی تدوین کم ازکم ان مسائل میں مشکل نہیں ہے جو آجکل کے زمانے کی طرح پہلے زمانے میں بھی موجود تھے۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ کسی ایک فقہ کی رائے جو خاص زمانے کے لئے دی گئی ہو آجکل کے زمانے میں بھی قابل اطلاق ہو۔ بہت سے معاملات ایسے بھی ہوسکتے ہیں جن میں انہی مسئلوں میں جو پہلے زمانے میں بھی تھے دوسرے ائمہ کی رائے موجودہ زمانے سے کہیں زیادہ مطابقت رکھتی ہو جتنی کہ اس مسلک کے ائمہ کی رائے سے رکھتی ہے جن کے مسلک کی تقلید ملک کی اکثریت کرتی ہے۔ اس لئے یہ رائے مسئلہ کا نہ تو حل ہے اور نہ قابل قبول ہوسکتی ہے۔ میں پھر اس بات کا اعادہ کرونگا کہ باوجود اس کے کہ عوام کو اختیار حاصل ہے کہ وہ قوانین کے تعارض کو دور کرنے کے لئے فیڈرل شریعت کورٹ میں آئیں۔ لیکن باعث افسوس یہ ہے کہ اس سے آج تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ یہی ایک مشکل ہے جو تدوین شریعت کے راستے میں حائل ہے اس کا دور کرنا علماء اور دیگر اداروں کا کام ہے۔